استدراک

مسئلہ تحلیل ربوا پر ایک قانونی نظر

از ایڈیٹر

ہم کو مولانا مناظر احسن صاحب کی رائے سے جن جن امور میں اختلاف تھا، ان کا اظہار مختصر طور پر حواشی میں کر دیا گیا ہے لیکن جن اصولی مسائل پر مولانا نے اپنے استدلال کی بنا رکھی ہے ان پر روشنی ڈالنے کے لیے محض وہ اشارات کافی نہیں ہیں جو حواشی میں کیے گئے ہیں، لہٰذا یہ مفصل نوٹ علیحدہ لکھا جا رہا ہے۔

مولانا کے استدلال کی بنا حسب ذیل امور پر ہے۔

مولانا کے دلائل کا خلاصہ (۱) ان کا دعویٰ ہے کہ نہ صرف تحریم ربوٰ کا حکم، بلکہ تمام عقود فاسدہ اور ناجائز معاشی وسائل کی ممانعت کے احکام بھی صرف اُن معاملات سے تعلق رکھتے ہیں جو مسلمان اور مسلمان کے درمیان ہوں بالفاظ دیگر غیر قوموں کے ساتھ جو معاملات پیش آئیں ان میں حرام و حلال اور جائز و ناجائز کی کوئی تمیز نہیں۔

(۲) ان کے نزدیک شریعت نے تمام ان غیر مسلموں کو مباح الدم والاموال قرار دیا ہے جو ذمی نہ ہوں، لہٰذا ایسے غیر مسلموں کا مال جس طریقہ سے بھی لیا جائے جائز ہے، عام اس سے کہ وہ سود ہو

یا قمار ہو، یا ان کے ہاتھ شراب اور لحم خنزیر اور مردار فروخت کیا جائے یا اور دوسرے وہ طریقے اختیار کیے جائیں جن کو اسلام نے "مسلمانوں کے مقابلہ میں" اختیار کرنے کو حرام ٹھیرایا ہے مسلمان جس طرح بھی ان کا مال لیں گے اس کی حیثیت مال غنیمت یا فے کی ہوگی، اور وہ ان کے لیے حلال وطیب ہے۔

(۳) ان کی رائے میں ہر وہ ملک جہاں اسلامی حکومت نہیں ہے، دار الحرب ہے اور اس کے غیر مسلم باشندے حربی ہیں۔ وہ دار الکفر کو دار الحرب کا، اور کافر غیر ذمی کو حربی کا ہم معنی سمجھتے ہیں اس لیے اُن کے نزدیک تمام وہ ممالک جن پر غیر اسلامی سلطنتیں قابض ہیں پورے معنوں میں دار الحرب ہیں، اور وہاں علی الدوام وہی احکام مسلمانوں پر جاری رہنے چاہئیں جو دار الحرب کے متعلق کتب فقہ میں مذکور ہیں۔

(۴) دار الحرب کی جو تعریف فقہائے متقدمین نے کی ہے وہ مولانا کی رائے میں پوری طرح ہندوستان پر چسپاں ہوتی ہے۔ اور اس ملک کے مسلمانوں کی فقہی پوزیشن اُن کی رائے میں "مستامن" کی ہے۔ دوسرے الفاظ میں مسلمان اس دار الحرب میں اس حیثیت سے رہتے ہیں کہ انہوں نے یہاں کی حربی سلطنت سے امان لے لی ہے۔

(۵) مستامن کے متعلق اسلامی قانون یہ ہے کہ وہ اُس غیر اسلامی سلطنت کے قانون کی خلاف ورزی نہیں کرسکتا جس سے امان لے کر وہ اس کے ملک میں رہتا ہو۔ لہٰذا مولٰنا کی رائے میں ہندوستان کے مسلمانوں پر انگریزی قانون کی اطاعت تو ایسی فرض ہے کہ اگر ایک سرمو اس سے انحراف کریں گے تو عذاب جہنم کے مستحق ہوں گے لیکن اسلام کے اکثر احکام اور قوانین کی اطاعت سے وہ بالکل آزاد ہیں اس لیے کہ وہ دار الحرب میں مقیم ہیں۔ قتل، غارت گری، چوری، ڈکیتی، رشوت، ٹھگی اور ایسے ہی دوسرے ذرائع سے حربی کفار کو نقصان پہنچانا اور ان کا مال لینا ہندوستانی مسلمانوں کے لیے صرف اس وجہ سے ناجائز ہے کہ انگریزی قانون اس کو ناجائز کہتا ہے، نہ اس لیے کہ یہ افعال

بجائے خود اسلامی شریعت میں حرام ہیں کیونکہ تمدن اور معیشت اور اخلاق کے بیشتر معاملات میں ہندوستان کے اندر اسلامی شریعت اُس وقت تک منسوخ ہے جب تک یہاں غیر اسلامی حکومت قائم ہے۔ اب شریعت کے قوانین میں سے صرف قانون معاہدہ کا اطلاق یہاں کے مسلمانوں پر ہوتا ہے۔ اور اس کی رو سے لین دین اور کسب مال کے جو ذرائع انگریزی قانون میں ناجائز ہیں ان کو اختیار کرنا تو ہندوستانی مسلمانوں کے لیے شرعاً حرام ہے بخلاف اس کے جن ذرائع کو شریعت نے حرام ٹھیرایا ہے اور انگریزی قانون حلال ٹھیراتا ہے وہ سب کے سب قانوناً بھی حلال ہیں اور شرعاً بھی حلال، نہ دنیا میں ان پر کوئی تعزیر، نہ آخرت میں کوئی مواخذہ۔

دلائل مذکورہ پر مجمل تبصرہ | ہمارے نزدیک ان میں سے ایک بات بھی صحیح نہیں خود حنفی قانون بھی جس کے نمائندے کی حیثیت سے مولانا نے یہ تمام تقریر فرمائی ہے۔ ان بیانات کی تائید نہیں کرتا۔ اس مضمون میں مولانا نے اسلامی قانون کی جو تصویر پیش کی ہے وہ صرف غلط ہی نہیں بدنما بھی ہے۔ اس کو دیکھ کر اسلام اور مسلمانوں کے متعلق ہرگز کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ اگر کوئی ناواقف شخص اس تصویر کو دیکھے گا تو وہ اسلام کو دنیا کا بدترین مذہب اور مسلمانوں کو ایک نہایت خطرناک قوم سمجھے گا، اور خدا کا شکر ادا کرے گا کہ انگریزی قانون نے ان "مامونین" کے ہاتھ سے دوسری قوموں کی جان و مال اور آبرو کو بچا رکھا ہے۔ دوسری طرف اگر شریعت کی اسی تعبیر کو قبول کرکے ہندوستان کے مسلمان اس ملک میں زندگی بسر کرنا شروع کردیں تو شاید پچاس برس کے اندر اُن میں برائے نام بھی اسلام باقی نہ رہے بلکہ اگر خدانہ کردہ انگریزی تسلط کے آغاز سے ہندوستان میں انہی اصولوں پر عمل درآمد کیا گیا ہوتا تو آج جو کچھ رہی سہی اسلامیت ہندوستان کے مسلمانوں میں نظر آتی ہے یہ بھی نہ ہوتی، اور ڈیڑھ سو برس کے اندر ہندوستان کے مسلمان بالکل مسخ ہو چکے ہوتے۔ البتہ یہ ضرور ممکن تھا کہ ان کی جائدادوں کا ایک حصہ محفوظ رہ جاتا اور ان میں بھی مارواڑیوں اور بنیوں اور سیٹھوں کا ایک طبقہ پیدا ہو جاتا۔

حاشا و کلا، ہمارا یہ مقصود نہیں کہ مولنٰا نے بالقصد اسلام کی غلط نمایندگی کی ہے۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ انہوں نے قانون اسلامی کو جیسا کچھ سمجھا ہے، غایت درجہ دیانت اور نیک نیتی کے ساتھ ویسا ہی ظاہر فرما دیا ہے مگر ہمیں اعتراض در اصل ان کے مفہوم اور ان کی تعبیر پر ہی ہے گو راقم سطور کو اپنے "عامی" ہونیکا اعتراف ہے اور ایک عالم کے مقابلہ میں شریعت کے کسی مسئلہ پر کلام کرنا خطرے سے خالی نہیں لیکن اس عامی نے قانون اسلامی کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اس کی روشنی میں وہ یہ کہنے کی جرأت کرتا ہے کہ خاص ان مسائل کی حد تک جو اوپر مذکور ہوئے ہیں، مولنٰا نے شریعت کے اصول اور احکام کو ٹھیک ٹھیک نہیں سمجھا ہے۔ اس غلط فہمی کے دو وجوہ قرین قیاس ہیں۔

اوّلاً، ائمۂ مجتہدین نے جس زمانہ میں سلطنت اسلامی کے دستوری قانون (Constitutional Law) اور بین الاقوامی معاملات کے متعلق کتاب و سنت کی ہدایات اور خود اپنے اجتہاد سے یہ احکام مدون کیے تھے، اس زمانہ میں فقہاء کی حیثیت محض اصحاب درس و تدریس ہی کی نہ تھی بلکہ وہی سلطنت کے قانونی مشیر اور عدالتوں کے صدر نشین بھی تھے۔ رات دن اسلامی سلطنت میں نئے نئے دستوری اور بین الاقوامی مسائل پیش آتے تھے اور ان میں انہی بزرگوں کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔ ہمسایہ قوموں سے جنگ و صلح کے معاملات ہوتے رہتے تھے، اسلامی سلطنتوں کی رعایا اور غیر مسلم سلطنتوں کی رعایا کے درمیان معاملات اور تعلقات کی گوناگوں صورتیں پیش آتی تھیں اور ان سے جو قانونی مسائل پیدا ہوتے تھے ان کا تصفیہ کرنے والے یہی حضرات تھے۔ یہ لوگ اپنے فیصلوں اور تجویزوں میں جو قانونی اصطلاحات و عبارات استعمال کرتے تھے، ان کے مفہومات کا تعین محض لفظی تشریحات پر منحصر نہ تھا، بلکہ ان کی اصلی شرح وہ واقعی حالات تھے جن پر یہ اصطلاحات و عبارات منطبق ہوتی تھیں پس اگر کسی اصطلاح یا عبارت میں کوئی ابہام رہ جاتا تھا یا ایک چیز کے مختلف مدارج پر ایک ہی اصطلاح استعمال کی جاتی اور بظاہر الفاظ میں فرق مدارج پر دلالت کرنے والی کوئی چیز نہ ہوتی، یا ایک وسیع مفہوم پر ایک لفظ بولا جاتا اور صرف موقع و محل کے لحاظ سے اس کے

مختلف مفہومات میں تمیز ہوتی، تو اس سے عملاً قانون کے انطباق اور استعمال میں کوئی قباحت واقع ہونے کا خطرہ نہ تھا۔ نہ یہ اندیشہ تھا کہ کوئی قانون داں شخص کسی حکم کو محض الفاظ کے واضح نہ ہونے کی وجہ سے بالکل مختلف صورت حال پر چسپاں کردے گا۔ اس لیے کہ اس وقت اسلامی قانون کی اصطلاحات اور مخصوص قانونی عبارات کی حیثیت رائج الوقت سکوں کی سی تھی علمی دنیا میں ان کا چلن تھا۔ ان کے مفہومات کو سمجھنے اور ٹھیک موقع پر استعمال کرنے، اور ہر ایک کی صحیح حد معلوم کرنے میں کوئی دقت نہ تھی ہر قانون داں شخص کو شب و روز ان حالات سے بالواسطہ یا بلاواسطہ دوچار ہونا پڑتا تھا جن میں یہ زبان برتی جاتی تھی۔ مگر اب ایک مدت سے وہ صورت حال مفقود ہے۔ دستوری مسائل اور بین الاقوامی معاملات سے بالفعل علماء کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ اسلامی سلطنتیں مٹ گئیں اور جو سلطنتیں باقی ہیں ان میں بھی یہ مسائل علمائے شریعت سے متعلق نہیں ہیں۔ علمی دنیا میں اسلامی قانون کی اصطلاحات و عبارات کا چلن بھی مدتوں سے بند ہو چکا ہے۔ اب یہ پرانے تاریخی سکے ہیں جن کی قیمت کا وہ حال نہیں کہ رواج کی وجہ سے بازار میں ہر آدمی کے لیے وہ ایک جانی پہچانی چیز ہو۔ بلکہ ان کی پرانی قدر رائج (Market value) معلوم کرنے کے لیے پرانے ریکارڈوں کی چھان بین کرنا اور زمانۂ حال کے عملی برتاؤ پر قیاس کرکے اس زمانے کے واقعی حالات کو سمجھنے کی کوشش کرنا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں تک مسائل سیاسی و دستوری کا تعلق ہے فقہ اسلامی کے احکام کو سمجھنا، مسائل نکاح و وراثت وغیرہ کو سمجھنے کی بہ نسبت زیادہ مشکل ہے خصوصاً جہاں ہماری کتب فقہیہ میں عبارات مبہم رہ گئی ہیں یا اصطلاحات میں توسع پایا جاتا ہے وہاں علماء کے لیے قانون کو ٹھیک ٹھیک سمجھنا اور اس کی صحیح تعبیر کرنا اور بھی زیادہ مشکل ہو جاتا ہے، کیونکہ اب ان کے صرف الفاظ ہی الفاظ رہ گئے ہیں، کتابوں کے متون بھی لفظی ہیں اور ان کی شروح بھی لفظی۔

دوسری وجہ جس کی طرف خود مولانا نے بھی اشارہ کر دیا ہے، یہ ہے کہ گذشتہ صدی ڈیڑھ صدی سے مسلمانوں پر جو معاشی تباہی مسلط ہوئی ہے، اور جس طرح دیکھتے دیکھتے ان کی کروڑوں اور اربوں روپے

کی جائدادیں کوڑیوں کے مول نکلی ہیں، اور جس طرح مسلمانوں کے بڑے بڑے خوشحال گھرانے روٹیوں کو محتاج ہوئے ہیں۔ اس کو دیکھ دیکھ کر ہر دردمند مسلمان کی طرح مولنا کا دل بھی دکھا ہے اور انہوں نے غایت درجہ دلسوزی کے ساتھ کوشش کی ہے کہ شریعت میں اس مصیبت کا کوئی حل تلاش کریں۔ اس جذبہ کے اثر سے اکثر مقامات پر ان کا قلم اعتدال اور فقیہانہ احتیاط سے ہٹ گیا ہے (مثلاً ان کا یہ ارشاد کہ ہندوستان میں سود نہ لینا گناہ ہے، یا یہ بیان کہ عقود فاسدہ کی ممانعت کے جملہ احکام صرف مسلمانوں کی باہمی معاملت تک محدود ہیں) جہاں تک مسلمانان ہند کے موجودہ روح فرسا حالات کا تعلق ہے کون مسلمان ایسا ہوگا جس کا دل ان کو دیکھ کر نہ دکھتا ہو، اور کون اس کا خواہشمند نہ ہوگا کہ ان مصائب سے مسلمان نجات پائیں۔ اس باب میں ہمارے درمیان ذرہ برابر بھی کوئی اختلاف نہیں۔ مگر میں یہ ماننے سے قطعی انکار کرتا ہوں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی معاشی تباہی کسی حیثیت سے بھی، بالواسطہ یا بلاواسطہ، سود نہ کھانے کی وجہ سے ہے، اور اس حالت کا بدلنا سود کی تحلیل پر موقوف ہے۔ بلکہ میں یہ بھی تسلیم نہیں کرتا کہ تحریم سود کسی ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ میں بھی مسلمانوں کی معاشی ترقی میں مانع ہے۔ جو شخص يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ پر ایمان رکھتا ہو، اور جو اس ارشاد ربانی کو معاش اور معاد دونوں میں ایک اٹل حقیقت سمجھتا ہو اس کو کبھی اس قسم کے شبہات میں مبتلا نہ ہونا چاہیئے۔ اگر مولنا غور فرمائیں گے تو ان پر یہ حقیقت منکشف ہوجائے گی کہ مسلمانوں کی معاشی تباہی کا اصلی سبب سود نہ کھانا نہیں ہے، بلکہ سود کھلانا اور ادائے زکوٰۃ سے جی چرانا، اور اسلامی نظم معیشت کو بالکل معطل کردینا ہے۔ جن گناہوں کی سزا مسلمانوں کو مل رہی ہے وہ در اصل یہی ہیں۔ اگر وہ ان گناہوں پر قائم رہے اور اس پر سود خواری کا اضافہ اور ہوگیا تو ممکن ہے کہ چند افراد قوم پر خود مولنا کی اپنی زبان میں مالی آماس چڑھ جائے اور اس سے چند سیدھے سادے مسلمان دھوکہ کھا جائیں، لیکن درحقیقت اس سے بحیثیت مجموعی قوم کی معاشی حالت

میں کوئی اصلاح نہ ہوگی اور دوسری طرف مسلمانوں کی اخلاقی حالت اور ان کی باہمی الفت و مونست اوران کے تعاطف و تراحم اور تعاون و تناصر میں شدید انحطاط رونما ہوگا یہاں تک کہ ان کی قومیت مضمحل ہوجائے گی۔

آپ سود کا نام خواہ "پھاؤ" رکھ دیجیے یا مائدۃ من السماء کہکر پکاریے، اس کی حقیقت اور فطری خاصیت میں بال برابر بھی تغیر واقع نہ ہوگا۔ سود اپنی عین فطرت کے لحاظ سے زکوٰۃ کی ضد ہے اور اس نفسیاتی حقیقت میں کسی ملک کے دارالحرب یا دارالاسلام ہونے سے کوئی تفاوت نہیں ہوتا۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ ایک معاشی زندگی میں یہ دونوں یکجا جمع ہوجائیں۔ ایک وہ ذہنیت ہے جس کو روپیہ گننے اور گن گن کر سنبھالنے اور ہفتوں اور مہینوں کے حساب سے بڑھانے، اور اس کی بڑھوتری کا حساب لگانے میں مزا آتا ہے۔ دوسری وہ ذہنیت ہے جس کو قوت بازو سے کمانے اور کماکر کھانے اور کھلانے اور راہ خدا پر لٹا دینے میں مزا آتا ہے۔ کیا کوئی عاقل یہ تصور کرسکتا ہے کہ یہ دونوں ذہنیتیں ایک ہی دل و دماغ میں جمع ہوسکیں گی؟ کیا یہ امید کی جاسکتی ہے کہ جب مسلمان کو سود پر روپیہ لگانے اور یوماً فیوماً اس کے نشوونما پر نظر رکھنے کا چسکا لگ جائے گا تو اس کے بعد بھی اس کی جیب سے زکوٰۃ و صدقات کے لیے ایک پیسہ نکل سکے گا؟ کیا اس کے بعد بھی کوئی مسلمان مسلمان کو قرض حسن دینا گوارا کرے گا؟ کیا اس کے بعد مسلمانوں کی حالت بھی اس قوم کی سی نہ ہوجائے گی جس کے متعلق قرآن میں کہا گیا ہے کہ ثم قست قلوبکم من بعد ذٰلک فھی کالحجارۃ او اشد قسوۃ اور ولتجدنھم احرص الناس علی حیوۃ؟ چند قارون اور شائلاک پیدا کرنے کے لیے پوری قوم آخر کیوں خودکشی کرے؟ اور اس خودکشی کو جائز ثابت کرنے کے لیے خدا اور رسول کے قانون کی غلط تاویل کیوں کی جائے؟ اور امام اعظم ابوحنیفۃ النعمان جیسے بزرگ کو اس ذمہ داری میں کیوں شریک کیا جائے؟

پھر میں کہتا ہوں کہ دنیا میں صرف مسلمان ہی ایک ایسی قوم ہے جو تیرہ سو برس سے سرمایہ داری کی

مخالفت پر قائم ہے اور جس نے عملاً اس فاسد نظام کو مٹانے کی کوشش کی ہے۔ اس قوم کو جو چیز ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سرمایہ داری کی عداوت پر قائم رکھنے والی، اور نظام سرمایہ داری میں جذب ہونے سے بچانے والی ہے وہ زکوٰۃ کی فرضیت اور سود کی تحریم ہی ہے۔ سوشلسٹ اور کمیونسٹ اور نہلسٹ سب سرمایہ دار سے سمجھوتہ کر سکتے ہیں، مگر جب تک یہ دو زبردست رکاوٹیں قائم ہیں، مسلمان کبھی اس سے سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام وہ قومیں سرمایہ داری میں جذب ہو گئیں جن کے مذہب نے سود سے منع کیا تھا، مگر مسلمان تیرہ صدیوں سے اس کے مقابلہ میں جما ہوا ہے۔ اب کہ خود دنیا والوں میں بھی بصارت پیدا ہو رہی ہے اور وہ سرمایہ داری کو مٹانے کے لیے فوج در فوج جمع ہو رہے ہیں، یہ کیسی بدبختی ہوگی کہ مسلمان خود میدان مقابلہ سے ہٹ جائے اور اپنے ہاتھوں اپنے قلعہ کے مستحکم برجوں کو مسمار کر کے سرمایہ داری کی طرف مصالحت کا ہاتھ بڑھانے لگے۔

اس ضروری تمہید کے بعد اب ہم اصل قانونی بحث کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

کیا عقود فاسدہ صرف مسلمانوں کے درمیان ممنوع ہیں؟

مولانا کے پہلے دعوے کی بنا یہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں کسب مال کے ناجائز ذرائع سے روکا گیا ہے وہاں "بَیْنَکُمْ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان آپس میں عقود فاسدہ پر معاملات نہ کیا کریں۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ (النساء ۵) اب یہ ظاہر ہے کہ سود بھی کسب مال کے ناجائز طریقوں میں سے ایک طریقہ ہی ہے۔ لہٰذا قرآن میں أَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا۔ جو فرمایا گیا ہے، یہ بھی اگرچہ ظاہر الفاظ کے لحاظ سے عام حکم ہے، مگر جس اصل کی فرع ہے اس کے ساتھ بالتبع اس کو بھی صرف مسلمانوں کے باہمی معاملات تک ہی محدود سمجھنا چاہیے۔ اس کی مزید تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جو مکحول نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ لَا رِبٰوا بَيْنَ الْمُسْلِمِ وَالْحَرْبِي۔ یعنی مسلمان اور حربی کافر کے

درمیان تفاضل کے ساتھ جو لین دین ہو اس پر لفظ "سود" کا اطلاق ہی نہ ہوگا۔ بالفاظ دیگر لا ربوا کے معنی یہ ہیں کہ غیر ذمی کافر سے جو سود لیا جائے وہ سود ہی نہیں، پھر وہ حرام کیسے ہوا؟

یہ مولانا کے استدلال کا خلاصہ ہے اس میں پہلی اور بنیادی غلطی یہ ہے کہ قرآن کے مقاصد سے قطع نظر کرکے صرف ظاہر الفاظ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ قرآن کا عام انداز بیان یہ ہے کہ وہ اخلاق اور معاملات کے متعلق جتنی ہدایتیں دیتا ہے ان میں صرف اہل ایمان کو مخاطب کرتا ہے، اور ان سے کہتا ہے کہ تم آپس میں ایسا کیا کرو یا نہ کیا کرو۔ اس طرز بیان میں کچھ دوسری حکمتیں ہیں جن کے ذکر کا یہ موقع نہیں۔ یہاں صرف یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ اس قسم کے انداز بیان میں اخلاق اور معاملات کے متعلق جتنے احکام اللہ تعالیٰ نے دیے ہیں، ان کو فقہائے امت میں سے کسی نے بھی صرف مسلمانوں کے باہمی معاملات تک محدود قرار نہیں دیا ہے۔ کسی نے یہ نہیں کہا کہ مسلمان اور مسلمان کے درمیان جو افعال حرام ہیں مسلمان اور کافر کے درمیان وہی حلال یا مستحب ہیں۔ اگر ایسا ہو تو درحقیقت اسلامی اخلاقیات اور قانون مدنی کی جڑ ہی کٹ جائے۔ مثلاً ارشاد باری ہے وَلَا تَتَّخِذُوا أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ (النحل: ۱۳) کیا اس کا یہ مطلب لیا جائیگا کہ مسلمان صرف مسلمان سے جھوٹی قسم نہ کھائے، رہے غیر مسلم تو ان سے دروغ حلفی کرنے میں کوئی مضایقہ نہیں؟ فرمان الٰہی ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ (انفال: ۳) کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ مسلمان صرف ان امانتوں کی حفاظت کریں جو مسلمانوں سے تعلق رکھتی ہوں؟ باقی رہی کافر کی امانت تو اس میں بے تکلف خیانت کر ڈالی جائے؟ پھر یہ جو فرمایا کہ فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ (بقرہ: ۳۹) تو کیا اس کی یہ تاویل کی جائے گی کہ مسلمان کے بجائے کوئی کافر اگر کسی مسلمان پر بھروسہ کرکے بغیر لکھا پڑھی کیے اپنا کچھ مال اس کے پاس رکھوا دے تو وہ "مباح" سمجھ کر اس کو کھا سکتا ہے؟ پھر یہ جو حکم دیا گیا ہے کہ

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ اور وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا اور وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ اور وَاَشْهِدُوْا اِذَا تَبَايَعْتُمْ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ (بقرہ : ۳۹) تو کیا یہ سب احکام صرف مسلمانوں کے باہمی معاملات ہی کے لیے ہیں ؟ کیا کافر کے لیے شہادت سے انکار کرنا یا سچی شہادت چھپا کر جھوٹی شہادت دینا یا دستاویز کے غیر مسلم کاتب یا گواہ کو خوف زدہ کرنا یہ سب جائز افعال ہیں ؟ اس کے بعد جو یہ حکم دیا گیا ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (النور : ۲) تو کیا اس سے یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ غیر قوموں کے اندر فحش اور بدکاری پھیلانا مسلمان کے لیے جائز ہے ؟ اور یہ جو فرمان ہوا کہ اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (النور : ۳) تو کیا اس کی یہی تاویل کی جائے گی کہ کفار کی عورتوں پر جھوٹی تہمتیں دل کھول کر لگاؤ ؟ اور یہ جو ارشاد ہوا کہ وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (النور : ۴) تو کیا اس کو یہ معنی پہنائے جائیں گے کہ کافر عورتوں کو حرام کاری پر مجبور کرنا اور اُن کی خرچی کھانا جائز ہے ؟ کیا اس طرح کی تاویل کر کے کسی مسلمان کے لیے یہ حلال ہو گا کہ پیرس میں سرکاری لائسنس لے کر ایک قحبہ خانہ کھول دے ؟ پھر یہ جو ارشاد ہوا ہے کہ وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ (الحجرات : ۲) تو کیا اس کی یہ تاویل ہو گی کہ صرف مسلمان کی غیبت ناجائز ہے ؟ باقی رہا کافر تو اس کی غیبت کرنے میں کوئی بُرائی نہیں ؟ اگر اسی اصول پر قرآن اور سنت کے احکام کی تاویل کی جائے اور مسلمان اسی کا اتباع شروع کر دیں تو اندازہ فرمائیے کہ یہ قوم کیا سے کیا بن کر رہے گی ؟

بالفرض اگر بلا دلیل یہ مان بھی لیا جائے کہ صرف لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ

ہی کا حکم مسلمانوں کے باہمی معاملات کے لیے مخصوص ہے اور یہ قاعدہ دوسرے احکام میں جاری نہ ہوگا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر ذمّی کافروں کو سودی لین دین سے کیوں روکا گیا؟ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلم جماعتوں سے اس قسم کے معاہدات کیوں کیے کہ وہ سودی کاروبار چھوڑ دیں ورنہ معاہدہ کالعدم ہوجائیگا؟ اور کتب فقہیہ میں یہ تصریح کیوں ہے کہ اگر کوئی حربی کافر دارالاسلام میں امان لے کر آئے تو اس سے بھی سود پر معاملہ کرنا حرام ہے؟۔

یہی حدیث لاربوٰ بین المسلم والحربی، تو اولاً اس میں لفظ حربی سے مراد محض غیر ذمّی کافر نہیں بلکہ برسرجنگ قوم کا فرد ہے جیسا کہ خود فقہائے حنفیہ کی تصریحات سے آگے چل کر ثابت کیا جائے گا۔

ثانیاً لاربوٰ کا یہ مفہوم نہیں کہ حربی کافر سے جو سود لیا جائے گا وہ سود ہی نہیں ہے بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ گو وہ صورۃً وحقیقۃً سود ہی ہے، لیکن اس کو قانون میں حرمت سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے اور اس کی حیثیت ایسی ہو گئی ہے کہ گویا وہ سود ہی نہیں ہے۔ ورنہ کسی سود کو یہ کہنا کہ وہ سود ہے ہی نہیں، اس قدر مہمل اور بے معنی بات ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اسے منسوب کرنے کو میں گناہ سمجھتا ہوں۔ یہ بالکل ایک معقول بات ہے کہ کسی خاص حالت میں سود کو تعزیر اور حرمت سے مستثنیٰ کر دیا جائے جس طرح خود قرآن نے اضطرار کی حالت میں مردار اور سور اور ایسی ہی دوسری حرام چیزیں کھا لینے کو مستثنیٰ کیا ہے لیکن یہ ایک نہایت غیر معقول بات ہے کہ سود کی حقیقت جوں کی توں باقی ہو، اور ہم ایک جگہ اس کو ربوٰ کہیں اور دوسری جگہ سرے سے اس کے ربوٰ ہونے ہی سے انکار کر دیں۔ اس طرح تو دنیا کے ہر فعل حرام کو محض تغیر اسم سے حلال کیا جا سکتا ہے جس خیانت کو جی چاہے کہہ دیجیے کہ یہ خیانت ہی نہیں جس جھوٹ کو جائز کرنا ہو کہہ دیجیے کہ اس پر لفظ جھوٹ کا اطلاق ہی نہیں ہوتا جس غیبت اور فحش اور حرام خوری کی طرف طبیعت مائل ہو اس کا نام بدل کر سمجھ لیجیے کہ اس کی حقیقت بھی بدل گئی۔ سرکار رسالتمآب کا مرتبہ اس سے

بہت بلند تھا کہ آپ اس قسم کے لفظی حیلے اپنی امت کو سکھاتے۔

ثانیاً اس حدیث میں جو حکم بیان ہوا ہے اس کی حیثیت محض ایک رخصت اور رعایت کی ہے، نہ یہ کہ اس کو مسلمانوں کا عام دستور العمل بنانا مقصود ہو میں اس بحث کو بالکل غیر ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ حدیث کس درجہ کی ہے کیونکہ حدیثوں کے ردّ و قبول میں فقیہ کے اصول محدث کے اصول سے ذرا مختلف ہوتے ہیں۔ امام اعظم اور امام محمد جیسے ائمۂ مجتہدین نے جس حدیث کو قابل استناد سمجھا ہو اس کو بالکل ناقابل اعتبار قرار دینا درست نہیں، مگر اس مختصر اور غیر واضح اور مختلف فیہ[1] خبر واحد کو اتنا پھیلانا بھی درست نہیں کہ قرآن اور حدیث اور آثار صحابہ کی متفقہ شہادت ایک طرف ہو اور دوسری طرف صرف یہ حدیث ہو، اور پھر بجائے اس کے کہ اس ایک حدیث کی تاویل ان سب کے مطابق کی جاتی، ان سب کو اس ایک حدیث پر ڈھالنے کی کوشش کی جائے۔ قرآن اور تمام احادیث صحیحہ میں مطلقاً ربوٰ کو حرام کہا گیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان نہ آپس میں اس کا لین دین کر سکتے ہیں نہ غیر قوموں کے ساتھ ایسا کاروبار کرنا ان کے لیے جائز ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل نجران سے جو معاہدہ کیا تھا اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان نہ صرف خود سودی لین دین سے پرہیز کریں گے بلکہ جن جن غیر مسلموں پر ان کا بس چلیگا ان کو بھی بجبر اس فعل سے روک دیں گے۔ تحریم ربوٰ کے بعد ایک واقعہ بھی ایسا پیش نہیں آیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علم و اجازت سے کسی مسلمان نے کسی ذمی یا غیر ذمی کافر کے ساتھ سودی معاملہ کیا ہو۔ خلفاء راشدین کے دور میں بھی اس کی کوئی نظیر پیش نہیں کی جا سکتی۔ اور یہ بات صرف سود ہی پر موقوف نہیں، عقود فاسدہ میں سے کوئی ایک عقد فاسد بھی ایسا نہیں جس کی تحریم کا حکم نازل ہو جانے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ و نے اس کے انعقاد کی کسی مسلمان کو اجازت دی ہو۔ نظری اور اصولی اہل حرب تو در کنار، جو لوگ عملاً برسر جنگ تھے، انہوں نے عین معرکۂ جنگ میں

[1] یہ بات نظر انداز نہ کرنی چاہیے کہ امام ابو یوسف، امام شافعی، امام مالک، امام احمد اور اکثر ارباب حدیث نے اس روایت کو رد کر دیا ہے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک عقد فاسد پر معاملہ کرنا چاہا اور کافی رقم پیش کی، مگر آپ نے اس کو لینے سے انکار کر دیا[1]۔ ایک طرف آیت قرآنی، اور نبی کے متعدد صریح و صحیح اقوال اور عہد نبوی کا ثابت شدہ عمل درآمد ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے نہ صرف سود بلکہ تمام عقود فاسدہ مطلقاً ناجائز ہیں اور اس میں مسلم و غیر مسلم یا حربی و ذمی کا کوئی امتیاز نہیں، دوسری طرف صرف ایک مرسل حدیث ہے جو ان سب کے خلاف حربی او مسلم کے درمیان صرف سود کو حلال ثابت کر رہی ہے۔ آپ نے اس حدیث کو اتنی اہمیت دی کہ اس کی بنیاد پر نہ صرف سود کو بلکہ تمام عقود فاسدہ کو تمام غیر ذمی کفار کے ساتھ عمومیت کے ساتھ حلال کر ڈالا۔ مگر ہم اس کو صحیح تسلیم کر کے اس سے صرف اتنی اجازت نکالتے ہیں کہ جنگ کی اضطراری حالتوں میں اگر کوئی مسلمان دشمن سے سود لے لے یا کسی اور عقد فاسد پر معاملہ کرلے تو اس سے مواخذہ نہ ہوگا۔

یہ محض ایک رخصت ہے اور ایسی رخصت ہے جس سے اولوالعزم مسلمانوں نے کبھی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اسلامی غیرت کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان کسی حال میں بھی حرام کی کمائی لینے پر آمادہ نہ ہو خصوصاً کفار اور دشمنوں کے مقابلہ میں تو اس کو اپنے قومی اخلاق کی بلندی اور بھی زیادہ شان کے ساتھ ظاہر کرنی چاہیے، اس لیے کہ مسلمان کی لڑائی دراصل تیر و تفنگ کی نہیں اصول اور اخلاق کی ہے۔ اس کا مقصد زرو زمین

[1] یہ واقعہ غزوۂ خندق کا ہے اور حضرت عبداللہ ابن عباس اس کے راوی ہیں۔ مشرکین میں سے ایک شخص کی لاش خندق میں گر پڑی تھی۔ انہوں نے مسلمانوں کو روپیہ دے کر وہ لاش ان سے خریدنی چاہی۔ مسلمانوں نے حضور سے دریافت کیا تو آپ نے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ (کتاب الخراج للامام ابی یوسف۔ طبع میریہ۔ ص ۱۲۳) اس سے معلوم ہوا کہ اگر جنگ کے موقع پر مسلمان کو دشمنوں سے عقود فاسدہ پر معاملہ کرنے کی اجازت دی بھی گئی ہے تو وہ کراہت سے خالی نہیں اور یہ بات مسلمان کے شایان شان نہیں کہ شدید حالت اضطرار کے بغیر اس سے فائدہ اٹھائے۔ اسی بات پر وہ واقعہ بھی دلالت کرتا ہے جو سیدنا ابوبکر صدیق کے ساتھ پیش آیا۔ انہوں نے مکہ میں تحریم قمار سے پہلے مشرکین سے ایک شرط کی تھی۔ پھر شرط کا روپیہ انہوں نے اس زمانہ میں ان سے وصول کیا جب مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان حالت جنگ قائم تھی اور صرف عارضی التوائے جنگ ہوا تھا لیکن حضور نے اس کو بھی حلال و طیب نہیں ٹھیرایا اور صدیق اکبر کو حکم دیا کہ اسے صدقہ کر دو۔

حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ وہ دنیا میں اپنے اصول پھیلانا چاہتا ہے۔ اب اگر اس نے اپنے مکارم اخلاق ہی کو کھو دیا، اور خود ہی ان اصولوں کو قربان کر دیا جن کو پھیلانے کے لیے وہ کھڑا ہوا ہے، تو پھر دوسری قوموں پر اس کی فوقیت ہی کیا باقی رہی؟ کس چیز کی بنا پر اس کو دوسروں پر فتح حاصل ہو گی اور کس طاقت سے، وہ دلوں اور روحوں کو مسخر کر سکے گا؟

دارالحرب کی بحث | اب ہمیں دوسرے سوال کی طرف توجہ کرنی چاہیے اور وہ یہ ہے کہ دارالحرب اور دارالاسلام کے فرق کی بنیاد پر سود اور تمام عقود فاسدہ کے احکام میں کیا فرق واقع ہوتا ہے، اور اس بیان کی کیا اصلیت ہے کہ تمام غیر ذمی کافر مباح الدم والاموال ہیں اس لیے ہر ممکن طریقہ سے ان کا مال لے لینا جائز ہے؟ اور اس تجویز کے لیے شریعت میں کیا گنجائش ہے کہ جس ملک پر کسی معنی میں اصطلاح دارالحرب کا اطلاق ہوتا ہو وہاں کے باشندوں پر لازماً وہ تمام احکام جاری ہونے چاہئیں جو دارالحرب سے تعلق رکھتے ہوں؟

اس سلسلہ میں یہ بات ذہن نشین کر لیجیے کہ شریعت یعنی قانون اسلامی کے تین شعبے ہیں۔ ایک اعتقادی قانون جو علی الاطلاق تمام مسلمانوں سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا دستوری قانون جس کا تعلق صرف سلطنت اسلامی سے ہے۔ تیسرا بین الاقوامی قانون یا صحیح الفاظ میں تعلقات خارجیہ کا قانون جو مسلمانوں اور غیر قوموں کے تعلقات سے بحث کرتا ہے۔ ہماری کتب فقہیہ میں ان قوانین کو الگ الگ مرتب نہیں کیا گیا ہے اور نہ اُن کو الگ الگ ناموں سے یاد کیا گیا ہے، لیکن قرآن و حدیث میں ایسے واضح اشارات کر دئیے گئے ہیں جن سے قدرتی طور پر اسلامی قوانین کا ارتقا تین الگ الگ راستوں پر ہوا ہے۔ بخصوصیت کے ساتھ حنفیہ اعظم کی قانونی بصیرت اور فقیہانہ وقیقہ سنجی نے سب سے بڑھ کر ان اشارات کو سمجھا اور ان کی بنا پر قانون کے ان تینوں شعبوں کی حدود میں ٹھیک ٹھیک امتیاز کیا، اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل میں اس امتیاز کو ملحوظ رکھا وہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ ہیں۔ فقہائے اسلام میں سے کوئی بھی اس معاملہ میں ان کا ہمسر نظر نہیں آتا حتیٰ کہ امام ابویوسف جیسے بالغ النظر فقیہ کی رسائی بھی اس مقام تک

نہ ہو سکی۔ امام اعظم کے کمال کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ ۱۲ سو سال پہلے انہوں نے قرآن اور سنت سے استنباط کرکے دستوری اور بین الاقوامی قوانین کے جو احکام مدون کیے تھے، آج تک دنیا کے قانونی افکار کا ارتقا ان سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھا ہے، بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ دراصل یہ ارتقا ہو اہی ان خطوط پر ہے جو ۱۲ صدی قبل کوفہ کے ایک پارچہ فروش نے کھینچ دیے تھے۔ فقہ حنفی کی بہ نسبت جدید زمانہ کے قوانین میں نظاً جو ترقی نظر آتی ہے وہ کسی حد تک تمدنی احوال کے تغیر کا، اور زیادہ تر بین الاقوامی معاہدات کا نتیجہ ہے تاہم اصولی حیثیت سے جدید زمانہ کے قوانین بڑی حد تک حنفی فقہ کا چربہ ہیں، اور ان کے مطالعہ سے حنفی فقہ کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔

اعتقادی قانون اعتقادی قانون کے لحاظ سے دنیا دو ملتوں پر منقسم ہے۔ اسلام اور کفر۔ تمام مسلمان ایک قوم ہیں اور تمام کفار دوسری قوم۔ اسلام کو ماننے والے سب کے سب اسلامی قومیت کے افراد ہیں اور اخوت دینی کی بنا پر سب کو ایک دوسرے پر حقوق حاصل ہیں۔ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ۔ (توبہ: ۲) مسلمان کی جان اس کا مال، اس کی عزت ہر دوسرے مسلمان کے لیے حرام ہے۔ ان دماءکم و اموالکم و اعراضکم علیکم حرام (حجۃ الوداع) اسلام کے جملہ احکام کی اطاعت ہر مسلمان پر واجب ہے خواہ وہ دنیا کے کسی کونے میں جا بسا ہو۔ جو کچھ فرض کیا گیا ہے وہ سب کے لئے فرض، جو کچھ حلال کیا گیا ہے سب کے لیے حلال ہے اور جو کچھ حرام ٹھیرایا گیا ہے سب کے لیے حرام ہے کیونکہ جملہ احکام کے مخاطب اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ہیں، کسی حال اور مقام کی قید اس کے ساتھ نہیں ہے۔ اس قومیت کے مقابلہ میں کفر ایک ملت ہے جس سے ہمارا اختلاف اصول اور اعتقاد اور قومیت کا اختلاف ہے۔ اس اختلاف کی بنا پر اصلاً ہمارے اور ان کے درمیان جنگ قائم ہے۔ الّا یہ کہ اس پر صلح یا معاہدہ یا ذمہ کی کوئی حالت عارض ہو جائے۔ پس اسلام اور کفر، اور مسلم اور کافر کے درمیان صلح اصل نہیں ہے بلکہ جنگ اصل ہے اور صلح اس پر عارض ہوتی ہے۔ مگر یہ جنگ بالفعل نہیں، بالقوۃ

ہے علمی نہیں نظری اور اصولی ہے۔ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ جب تک ہماری اور ان کی قومیت الگ ہے ہمارے اور ان کے اصول ایک دوسرے سے متصادم ہیں، ہم میں اور ان میں حقیقی و دائمی صلح اور دوستی نہیں ہو سکتی۔ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ (الممتحنہ : ۱)۔

اس مضمون کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مختصر حدیث میں تمام و کمال بیان فرما دیا ہے:-

امرت ان اقاتل الناس حتی یشھدوا ان لا الٰہ الا اللہ وان محمدا عبدہ ورسولہ وان یستقبلوا قبلتنا وان یاکلوا ذبیحتنا وان یصلوا صلوتنا فاذا فعلوا ذالک حرمت علینا دماؤھم واموالھم الا بحقھا لھم ما للمسلمین وعلیھم ما علی المسلمین (ابوداؤد۔ باب علی ما یقاتل المشرکین)	مجھ کو حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے لڑوں یہاں تک کہ وہ شہادت دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اس کا بندہ اور رسول ہے اور ہمارے قبلہ کی طرف منہ کریں اور ہمارا ذبیحہ کھائیں اور ہماری طرح نماز پڑھیں۔ جب وہ ایسا کریں گے تو ہمارے اوپر ان کے خون اور ان کے اموال حرام ہو جائیں گے بجز اس کے کہ کسی حق کے بدلے میں ان کو لیا جائے۔ ان کے حقوق وہی ہوں گے جو مسلمانوں کے ہیں اور ان پر فرائض وہی عائد ہوں گے جو مسلمانوں پر ہیں۔

اس اعتقادی قانون کی رو سے اسلام اور کفر کے درمیان ابدی جنگ ہے مگر یہ جنگ محض نظری (Theoretical) ہے۔ ہر کافر حربی (Enemy) ہے مگر اس معنی میں کہ جب تک ہماری اور اس کی قومیت الگ ہے ہمارے اور اس کے درمیان بنائے نزاع قائم ہے۔ ہر دار الکفر دار الحرب ہے مگر اس کا مفہوم صرف یہ ہے کہ جب تک وہ دار الکفر ہے محل حرب ہے یا بالفاظ دیگر حربیت کا کلی ارتفاع صرف اختلاف قومیت ہی کے مٹ جانے سے ہو سکتا ہے۔ اس قانون نے محض ایک نظریہ اور قاعدۂ اصلیہ

واضح طور پر مسلمانوں کے سامنے رکھ دیا ہے جس پر ان کی حکمت عملی کی بنا قائم ہے۔ باقی رہے حقوق و واجبات اور جنگ و صلح کے عملی مسائل تو ان کا اس قانون سے کوئی تعلق نہیں وہ دستوری اور بین الاقوامی قانون سے تعلق رکھتے ہیں۔

دستوری قانون | دستوری قانون کی رو سے دنیا کو دو حصوں پر تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک دارالاسلام۔ دوسرے دارالکفر۔ دارالاسلام وہ ہے جہاں مسلمانوں کی حکومت ہو اور اس حکومت میں اسلامی قانون بالفعل نافذ ہو یا حکمرانوں میں اتنی قوت ہو کہ اس قانون کو نافذ کر سکیں۔ اس کے مقابلہ میں جہاں مسلمانوں کی حکومت نہیں اور اسلامی قانون نافذ نہیں وہ دارالکفر ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے تمام وہ ممالک جن میں انگریزی حکومت ہے انگریزی علاقہ کہلائیں گے، اور جو علاقے ان حدود سے باہر ہوں گے ان کو علاقۂ غیر کہا جائے گا۔ اسلامی حکومت اسلام کے احکام کو صرف ان لوگوں پر نافذ کر سکتی ہے جو اس کے اپنے حدودِ عمل (Jurisdiction) میں رہتے ہوں۔ اسی طرح وہ صرف انہی اموال اور اعراض اور نفوس کی حفاظت کر سکتی ہے جو اس کے اپنے حدود اختیار یا علاقہ مقبوضہ (Territory) میں واقع ہوں۔ ان حدود کے باہر کسی چیز کی حفاظت کی وہ ذمہ دار نہیں ہے۔

اس قانون کے لحاظ سے ہر وہ جان اور مال اور عزت معصوم (Protected) ہے جو دارالاسلام میں اسلامی حکومت کی حفاظت کے اندر واقع ہو، عام اس سے کہ وہ مسلمان کی ہو یا کافر کی اور ہر وہ جان اور مال اور عزت غیر معصوم (Unprotected) ہے جو دارالکفر میں ہو اور جس کی محافظ اسلامی حکومت نہ ہو، عام اس سے کہ وہ مسلمان کی ہو یا کافر کی۔ غیر معصوم ہونے کا مآل صرف اس قدر ہے کہ اگر اس جان و مال یا عزت پر کسی قسم کا حملہ کیا جائے تو اسلامی حکومت اس کا کوئی مواخذہ نہ کرے گی؛ کیونکہ یہ فعل اس کے حدودِ عمل سے باہر واقع ہوا ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ خدا کے نزدیک وہ فعل گناہ ہو یا نہ ہو اور خدا کے ہاں اس پر مواخذہ ہو یا نہ ہو۔ پس کسی چیز کا غیر معصوم ہونا اس امر کو مستلزم نہیں ہے

وہ مباح بھی ہے نہ اس کی عدم عصمت کو اس معنی میں لیا جا سکتا ہے کہ اُسے نقصان پہونچانا یا اس پر قبضہ کرلینا عند اللہ بھی جائز اور حلال ہے۔ اسی طرح دستوری قانون کے نقطۂ نظر سے اگر کسی ایسے فعل کو جائز ٹھیرایا جائے جس کا ارتکاب دار الکفر میں کیا گیا ہو تو اس کا مفہوم صرف اس قدر ہوگا کہ اسلامی حکومت کو اس سے کوئی تعرض نہیں۔ وہ اس پر کوئی سزا نہ دے گی لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس فعل حرام پر خدا کے ہاں بھی کوئی گرفت نہ ہوگی۔

یہاں اعتقادی قانون اور دستوری قانون کے حدود الگ الگ ہوجاتے ہیں۔ اعتقادی قانون جس مسلمان کو بھائی کہتا ہے اور جس کی جان و مال کو حرام ٹھیراتا ہے وہ دستوری قانون کی نگاہ میں غیر معصوم ہے اس لیے کہ وہ سلطنت اسلامی کے حدود و اختیار سے باہر ہے۔ اور جس کافر کو اعتقادی قانون دشمن قرار دیتا ہے دستوری قانون اسے معصوم ٹھیراتا ہے صرف اس بنا پر کہ وہ اسلامی سلطنت کی حفاظت میں آگیا ہے۔ جس فعل کو اعتقادی قانون سخت گناہ اور حرام ٹھیراتا ہے، دستوری قانون اس کی کوئی گرفت نہیں کرتا کیونکہ وہ اس کے جورسڈکشن سے باہر ہوتا ہے۔ دونوں میں کھلا ہوا فرق یہ ہے کہ اعتقادی قانون کا تعلق آخرت سے ہے اور دستوری قانون کا تعلق صرف دنیا اور اس کے معاملات سے لیکن امام ابوحنیفہ کے سوا تمام فقہا نے کم وبیش ان دونوں میں خلط ملط کیا ہے اور ان کے حدود میں پوری طرح تمیز نہیں کرسکے ہیں۔

چند مثالوں سے ہم اس پیچیدہ مسئلہ کی توضیح کریں گے:۔

۱۔ فرض کیجیے کہ ایک مسلمان تاجر امان لے کر دار الحرب میں جاتا ہے اور وہاں سے کچھ مال چرا لاتا ہے۔ یہ فعل اعتقادی قانون اور بین الاقوامی قانون کی رو سے حرام ہے لیکن دستوری قانون اس شخص کو اس مال کا جائز مالک قرار دیتا ہے اور اس سے کوئی بازپرس نہیں کرتا۔ (ہدایہ۔ باب المستامن)۔

۲۔ فرض کیجیے کہ دار الاسلام کی رعایا کا ایک شخص دار الحرب میں قید تھا۔ وہ وہاں قید سے

چھوٹ گیا یا چھوڑ دیا گیا۔ اب وہ وہاں خواہ چوری کرے خواہ قتل کرے، سب کچھ دستوری قانون کی رو سے اس کے لیے مباح ہے (بحر الرائق ج ۵ صفحہ ۱۰۱)۔

(۳) فرض کیجیے کہ ایک شخص دار الحرب میں مسلمان ہوا اور وہاں سے ہجرت کرکے دار الاسلام میں نہیں آیا۔ اعتقادی قانون کی رو سے وہ مسلمانوں کا بھائی ہو چکا ہے۔ اس کا خون اور مال حرام ہو چکا ہے۔ مگر دستوری قانون کی رو سے وہ چونکہ اسلامی سلطنت کے جورسڈکشن سے باہر ہے اس لیے اس کی کوئی چیز معصوم نہیں۔ اس کی حیثیت وہی ہوگی جو غیر سلطنت کی رعایا کی ہے۔ اگر کوئی مسلمان دار الاسلام کے حدود سے باہر اس کو قتل کر دے تو اسلامی عدالت نہ اس پر قصاص لے گی نہ خوں بہا دلوائے گی، بطور خود وہ کفارہ ادا کر سکتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی مسلمان اس سے سود لے یا اس کے مال پر کسی دوسرے ناجائز طریقہ سے قبضہ کرے تو دستوری قانون کی رو سے یہ جائز ہے کیونکہ اس کا مال غیر معصوم ہے۔ اس باب میں فقہا کی تصریحات نہایت معنی خیز ہیں:

واذا اسلم رجل من اهل الحرب فقتله رجل من المسلمين قبل ان يخرج الى دار الاسلام خطأً فعليه الكفارة ولا دية عليه۔ وفي الاملاء عن ابي حنيفة رحمه الله انه لا كفارة عليه ايضا لان وجوبها باعتبار تقوم الدم لا باعتبار حرمة القتل ..... وتقوم الدم يكون بالاحراز بدار الاسلام (شرح السير الكبير مطبوعہ دائرة المعارف۔ ج ۱ صفحہ ۳۰)

اگر اہل حرب میں سے کوئی شخص مسلمان ہو چکا ہو اور قبل اس کے کہ وہ ہجرت کرکے دار الاسلام میں آئے کسی مسلمان نے اسے بلا ارادہ قتل کر دیا تو اس پر کفارہ ہے مگر خوں بہا واجب نہیں۔ اور ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے املاء میں یہ مسئلہ منقول ہے کہ اس پر کفارہ بھی نہیں ہے کیونکہ کفارہ کا وجوب خون کے باقیمت ہو جانے کے اعتبار سے ہے نہ کہ حرمت قتل کے اعتبار سے ..... اور خون صرف اس وقت باقیمت ہوتا ہے جب کہ وہ دار الاسلام میں آ چکا ہو۔

ولما ثبت بما قدمنا انه لا قيمة لدم المقيم في دار الحرب بعد اسلامه قبل الهجرة الينا ..... اجروه اصحابنا مجرى الحربي في اسقاط الضمان عن متلف ماله .... وان يكون ماله كمال الحربي من هذا الوجه ولذلك اجاز ابو حنيفة مبايعته على سبيل ما يجوز مبايعة الحربي من بيع الدرهم بالدرهمين في دار الحرب (احكام القرآن للجصاص الحنفي - ج ۲ - ص ۲۹۷)

اور جب ہماری پچھلی تقریر سے یہ ثابت ہو گیا کہ جو شخص مسلمان ہو کر ہجرت نہ کرے اور دار الحرب میں مقیم رہے اس کے خون کی کوئی قیمت نہیں ...... تو اسی بنا پر ہمارے اصحاب (حنفیہ) نے ایسے مسلمان کی حیثیت حربی ہی کی قرار دی ہے یعنی اس کے مال کو تلف کرنے والے پر بھی کوئی ضمان نہیں ..... اس حیثیت سے اس کا مال گویا حربی کا مال ہے اور اس بنا پر ابو حنیفہ نے اس کے ساتھ بھی اسی طرح خرید و فروخت کرنا جائز ٹھیرایا ہے جس طرح حربی کے ساتھ جائز ہے یعنی دار الحرب میں ایک درہم کو دو درہم کے عوض بیچنا۔

وقال الحسن بن صالح اذا اسلم الحربي فاقام ببلادهم وهو يقدر على الخروج فليس بمسلم يحكم فيه بما يحكم على اهل الحرب في ماله ونفسه (احكام القرآن)

حسن بن صالح کا قول ہے کہ جب حربی مسلمان ہونے کے بعد اہل حرب ہی کے علاقہ میں رہا درانحالیکہ وہ ہجرت کی قدرت رکھتا تھا تو اس کی حیثیت مسلمان کی نہیں اس کی جان و مال کا وہی حکم ہے جو اہل حرب کی جان و مال کا ہے۔

واذا اسلم الحربي في دار الحرب فقتله مسلم عمداً او خطأً وله ورثة مسلمون هناك فلا شيء عليه الا الكفارة في الخطأ (ہدایہ کتاب السیر)

جب کوئی حربی دار الحرب میں مسلمان ہو چکا ہو اور کوئی مسلمان اسے عمداً یا خطأً قتل کر دے اور اس کے کوئی مسلمان ورثہ بھی دار الحرب میں موجود ہوں تو اس پر قصاص یا دیت نہیں ہے خطا کی صورت میں محض کفارہ ادا کرنا ہے

وحکم من اسلم فی دار الحرب ولم یھاجر کالحربی عند ابی حنیفۃ لان مالہ غیر معصوم عندہ (بحر الرائق ج ۵ ص ۱۴۱)	اور جو شخص دار الحرب میں مسلمان ہو اور ہجرت نہ کرے اس کی حیثیت ابوحنیفہ کے نزدیک حربی کی ہے کیونکہ اس کا مال ان کی رائے میں غیر معصوم ہے۔

۴۔ فرض کرو کہ ایک مسلمان امان لیکر دار الحرب میں گیا اور وہاں اس نے کسی حربی سے قرض لیا یا اس کا مال غصب کر لیا۔ پھر وہ دار الاسلام واپس آگیا اور وہ حربی بھی دار الاسلام میں امان لے کر آیا یہاں وہ حربی مستامن اس قرض یا اس مال مغصوبہ کے لیے دار الاسلام کی عدالت میں کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اسلامی عدالت اس کو ایک پیسہ واپس نہ دلائیگی۔ اسی طرح اگر دار الحرب میں حربی نے مسلمان کا قرض مار لیا ہو یا اس کا مال غصب کر لیا ہو، پھر وہ حربی امان لیکر دار الاسلام میں آئے تب بھی اسلامی عدالت اس حربی کے خلاف اس مسلمان کی کوئی دادرسی نہ کرے گی۔ (الجامع الصغیر للامام محمد علی حاشیہ کتاب الخراج للامام ابی یوسف۔ ص ۷۵)

۵۔ اگر باپ دار الاسلام میں ہو اور اس کی نابالغ اولاد دار الحرب میں ہو تو اس اولاد پر سے باپ کی ولایت ساقط ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر مال کا مالک دار الاسلام میں ہو اور مال دار الحرب میں ہو تو مالک کی جان معصوم ہوگی مگر مال معصوم نہ ہوگا۔ (فتح القدیر ج ۴ ص ۳۵۵)

۶۔ دار الاسلام کی رعایا میں سے دو مسلمان امان لے کر دار الحرب میں چلے گئے اور وہاں ایک نے دوسرے کو قتل کر دیا۔ اگر قاتل دار الاسلام میں واپس آئے تو اس سے قصاص نہ لیا جائے گا۔ صاحب ہدایہ نے اس کی جو وجہ بیان کی ہے وہ قابل غور ہے:

وانما لایجب القصاص لانہ لایمکن استیفاءہ الابمنعۃ ولا منعۃ دون الامام وجماعۃ المسلمین ولم یوجد	اس پر قصاص اس لیے واجب نہیں کہ قصاص بغیر منعت (Protection) کے واجب نہیں آتا اور منعت بغیر امام اور جماعت مسلمین کے نہیں ہوتی

ذالک فی دار الحرب (ھدایہ کتاب السیر)

اور یہ چیز دار الحرب میں موجود نہیں ہے

۶۔ دار الاسلام کی رعایا میں سے دو مسلمان دار الحرب میں قید تھے۔ ان میں سے ایک نے دوسرے کو قتل کر دیا یا مسلمان مستامن نے کسی مسلمان اسیر کو قتل کر دیا۔ اس قاتل پر نہ قصاص ہے نہ خون بہا۔ علامہ ابن ہمام نے اس کی جو تشریح کی ہے وہ اور بھی زیادہ معنی خیز ہے۔ فرماتے ہیں :۔

فلا شئ علی القاتل من احکام الدنیا الا الکفارۃ فی الخطأ عند ابی حنیفۃ وانما علیہ عقاب الاخرۃ فی العمد.... لانہٗ صار بالاسر تبعا لھم..... وصار کالمسلم الذی لم یھاجر الینا فی سقوط عصمتہ الدنیویہ (فتح القدیر ج ۴ ص ۳۵)

ابوحنیفہ کے نزدیک قاتل پر احکام دنیا میں سے کچھ نہیں بجز اس کے کہ وہ خطا کی صورت میں کفارہ ادا کردے رہا قتل عمد (تو اس پر کفارہ بھی نہیں) البتہ آخرت کا عذاب ہے..... قصاص اور دیت کے ساقط ہونے کی وجہ یہ ہے کہ قید ہونے کی وجہ سے وہ اہل حرب کا تابع ہو گیا..... اور اس کی حیثیت اس مسلمان کی سی ہو گئی جس نے ہماری طرف ہجرت نہ کی ہو، اور اس حیثیت سے اس کی دنیوی عصمت ساقط ہو گئی۔

دیکھیے یہاں دستوری اور اعتقادی قانون کا فرق کس قدر نمایاں ہے۔ اعتقادی قانون مسلمانوں کو ایک قوم اور کفار کو دوسری قوم قرار دیتا ہے اور اس کا اقتضا، یہ ہے کہ مسلمان کی جان مال اور عزت کو کافر کی جان و مال اور عزت پر ترجیح دی جائے۔ لیکن دستوری قانون اس عالمگیر تقسیم کے بجائے اپنے حدود عمل (جورسڈکشن) کو حدود ارضی (Territorial limits) میں محدود کرتا ہے سلطنت اسلامیہ کے حدود میں جو جان ہے، جو مال ہے، جو شئے ہے وہ معصوم (Protected) ہے خواہ وہ مسلمان کی ہو یا کافر کی، کیونکہ سلطنت کا قانون اس کی حفاظت کا ذمہ لے چکا ہے۔ اور ان حدود کے باہر جو چیز ہے غیر معصوم (Unprotected) ہے خواہ وہ مسلم کی ہو یا کافر کی۔ اسلامی حدود کے اندر کوئی چوری کرے گا تو ہم ہاتھ کاٹیں گے، قتل کرے گا تو ہم قصاص یا دیت وصول کریں گے، ناجائز ذرائع سے مال لیگا تو واپس

دلائیں گے۔ اور ان حدود کے باہر کوئی مسلمان یا ذمی ایسا فعل کرے جو ہمارے قانون کی رو سے جرم ہو تو ہم نہ علاقۂ غیر میں اس کے خلاف کوئی کارروائی کر سکتے ہیں، نہ اپنے علاقہ میں واپس آنے کے بعد، اس لئے کہ فعل ان حدود میں ہوا ہے جہاں قیام امن اور حفاظت جان و مال کے ذمہ دار ہم نہیں ہیں لیکن یہ جو کچھ ہے دنیوی حیثیت سے ہے۔ حدود اسلامی سے باہر جو گناہ کیا جائے گا وہ دنیوی حکومت کے جورسڈکشن سے باہر ہونے کے باعث صرف دنیوی مواخذہ سے چھوٹ جائے گا۔ البتہ اللہ کے مواخذہ سے نہ چھوٹے گا کیونکہ اللہ کا جورسڈکشن حدود ارضی سے ناآشنا (Ultraterritorial) ہے، اس نے جو کچھ حرام ٹھیرایا ہے وہ ہر جگہ حرام ہے۔

یہ امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کا من گھڑت قانون نہیں ہے بلکہ قرآن اور حدیث سے ماخوذ ہے۔ وہی قرآن جو فَاِنْ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ اور وَمَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُہٗ جَہَنَّمُ خَالِدًا فِیْہَا کہتا ہے وہی حدود اسلامی کے اندر رہنے والے مسلمان اور علاقۂ غیر میں رہتے والے مسلمان کے خون میں فرق کرتا ہے۔ اول الذکر کو نادانستہ قتل کرنے والے پر کفارہ بھی ہے اور دیت بھی۔ اور موخر الذکر کے قاتل پر صرف کفارہ ہے[1]۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسامہ بن زید کو ایک سریہ کا افسر بنا کر حرقات کی طرف بھیجتے ہیں۔ وہاں ایک شخص لا الٰہ الا اللہ کہہ کر جان بچانا چاہتا ہے، مگر مسلمان اس کو قتل کر دیتے ہیں۔ حضور کو اس کی اطلاع ہوتی ہے تو اسامہ کو بلا کر بار بار فرماتے ہیں من لک بلا الٰہ الا اللہ یوم القیٰمۃ "قیامت کے روز تمہے لا الٰہ الا اللہ کے مقابلہ میں کون بچائے گا" مگر اس مقتول کی دیت ادا کرنے کا حکم نہیں دیتے[2]۔ ایسے ہی ایک دوسرے موقع پر حدود اسلامی سے باہر رہنے والے چند مسلمان مارے جاتے ہیں

[1] وان کان من قوم بینکم وبینھم میثاق کے یہ مراد ہے کہ اگر علاقہ غیر میں رہنے والا مسلمان کسی ایسی قوم سے ہو جس سے خون بہا کے باب میں مسلمانوں کا معاہدہ ہو چکا ہے تو جس طرح اس قوم کے ایک غیر مسلم فرد کا خونبہا دیا جائے گا۔ اسی طرح اس کے ایک مسلمان فرد کا بھی دیا جائے گا۔ پس یہ خونبہا معاہدہ کی بنا پر ہے نہ کہ عصمت اسلامی کی بنا پر۔ (ملاحظہ ہو سورۂ نساء رکوع ۱۳)

[2] ابوداؤد باب علی ما یقاتل المشرکین۔

تو حضور فرماتے ہیں انا بری من کل مسلم یقیم بین اظہر المشرکین" میں ہر ایسے مسلمان کی حفاظت سے بری الذمہ ہوں جو مشرکین کے درمیان رہتا ہو۔[1] خود قرآن میں بھی ایسے مسلمان کی ذمہ داری سے برأت کا اظہار کیا گیا ہے

والذین امنوا ولم یھاجروا مالکم من ولایتھم من شیئ حتی یھاجروا (۸ : ۱۰)

اور جو لوگ ایمان تو لے آئے مگر ہجرت کر کے (دار الاسلام میں) نہ آئے ان کی ولایت (حمایت وحفاظت) میں سے کوئی چیز تمہارے لیے نہیں ہے جب تک کہ وہ ہجرت نہ کریں۔

اس طرح قرآن اور حدیث نے خود ہی دنیوی عصمت کو دینی عصمت سے الگ کر دیا ہے اور دونوں کے حدود بتا دیے ہیں۔ تمام فقہائے اسلام میں صرف امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ ہی ایسے فقیہ ہیں جنہوں نے اس نازک اور پیچیدہ قانونی مسئلہ کو ٹھیک ٹھیک سمجھا ہے۔ امام ابویوسف، امام محمد، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل جیسے جلیل القدر مجتہدین بھی ان دونوں قسم کی عصمتوں میں پوری پوری تمیز نہیں کر سکے۔ چنانچہ مثال کے طور پر اگر دار الکفر میں اسلامی رعایا کا ایک فرد دوسرے فرد کو قتل کر دے تو یہ سب حضرات بالاتفاق فرماتے ہیں کہ قاتل سے قصاص لیا جائے گا کیونکہ اس نے ایک ایسے شخص کو قتل کیا جو "معصوم بالاسلام" تھا۔[2] پس جب اتنے بڑے بڑے ائمہ اس مسئلہ میں مختلط ہو گئے ہیں تو کچھ بعید نہیں کہ فقہ حنفی کے متاخر شارحین کو بھی امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے کلام کو سمجھنے میں یہی خلط پیش آیا ہو۔ امام صاحب کے متعلق ہم کو تحقیق ہے کہ اوپر جتنے مسائل بیان ہوئے ہیں ان میں اور اسی قبیل کے دوسرے مسائل میں انہوں نے دار الحرب کے بجائے "دار الکفر" کی اصطلاح استعمال کی تھی، کیونکہ دستوری قانون کے نقطۂ نظر سے دار الاسلام کا مقابل دار الکفر یعنی علاقۂ غیر یا (Foreign territory) ہی ہو سکتا ہے جو

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد۔ باب مذکور۔ اس دوسرے واقعہ میں حضور نے مقتولوں کی نصف دیت دلوائی تھی۔ اغلب یہ ہے کہ آپ کا یہ فعل اس آیت کے نزول سے پہلے کا ہو گا جس میں ایسے مقتول کی دیت ساقط کی گئی ہے۔

[2] ملاحظہ ہو الجامع الصغیر اور فتاویٰ قاضی خان۔

اور غیر حرب کا اس میں کوئی دخل نہیں، جو ممالک اسلامی سلطنت سے مسالمت رکھتے ہوں وہ بھی دارالکفر ہیں اور ان سے بھی وہ سب احکام متعلق ہیں جو اوپر بیان ہوئے لیکن چونکہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں جتنے دارالکفر اسلامی سلطنت سے متصل تھے، وہ عموماً دارالحرب ہی رہتے تھے؛ اس لیے بعد کے فقہار نے دارالکفر کو بالکل دارالحرب کا ہم معنی سمجھ لیا اور ان دونوں اصطلاحوں کے باریک قانونی فروق کو نظر انداز کر گئے۔

اسی طرح امام ابوحنیفہ کے کلام میں ہم کو کسی جگہ کوئی ایسا لفظ نہیں ملا جو اس پر دلالت کرتا ہو کہ وہ "غیر معصوم" کو "مباح" کے معنی میں لیتے تھے؛ وہ حدود دار اسلام سے باہر کی اشیار کو صرف "غیر معصوم" کہنے پر اکتفا کرتے ہیں، اور ایسی اشیا پر دست درازی کرنے والے کے لیے صرف اتنا کہتے ہیں کہ لاشئ علیہ - یالم یقص علیہ وغیرہ یعنی اس پر کوئی ذمہ داری نہیں، یا اس کے خلاف کوئی عدالتی فیصلہ صادر نہ کیا جائے گا۔ لیکن بعد کے فقہار نے اکثر مقامات پر "عدم عصمت" اور "اباحت" کو خلط ملط کر دیا جس سے یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ حدود اسلامی سے باہر جتنے ممنوع افعال کیئے جائیں ان پر جس طرح حکومت اسلامی بازپرس نہیں کرے گی اسی طرح خدا بھی بازپرس نہ کرے گا۔ حالانکہ یہ دونوں چیزیں بالکل الگ الگ ہیں۔ آپ ہندوستان میں کسی کا مال چرا لیجیے۔ ظاہر ہے کہ افغانستان کی عدالت میں آپ پر مقدمہ نہ چلایا جائے گا۔ دارالاسلام کے قانون کی رو سے آپ بری الذمہ ہیں۔ مگر اس کے معنی یہ کب ہیں کہ خدا کی عدالت سے بھی آپ چھوٹ گئے۔

اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کتب فقہ میں دارالحرب کے اندر سود اور قمار اور دوسرے عقود فاسدہ کی اباحت کا جو مسئلہ اس بنا پر لکھا گیا ہے کہ حربی کے لیے کوئی "عُصمت" (Protection) نہیں تو اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ دارالحرب سے مراد محض "علاقہ غیر" ہو۔ اس لحاظ سے یہ مسئلہ دستوری قانون سے تعلق رکھتا ہے، اور اس کی نوعیت یہ ہے کہ "حربی" (یعنی رعیت غیر Foreigner) کے مال کی حفاظت کا ذمہ چونکہ ہم نے نہیں لیا ہے اس لیے ہمارے جو رسڈکشن سے باہر ہماری سلطنت کا کوئی شہری (Citizen) اگر اس سے سود لے کر یا جوا کھیل کر یا کسی اور ناجائز ذریعہ سے مال لے کر ہمارے

علاقہ میں آجائے تو ہم اس پر کوئی مقدمہ قائم نہ کریں گے، اور اس مال پر اس شخص کی ملکیت کو جائز تسلیم کریں گے، قطع نظر اس کے کہ دین و اعتقاد کے نقطۂ نظر سے وہ مجرم ہو یا نہ ہو۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ دارالحرب سے مراد وہ ملک لیا جائے جس سے بالفعل جنگ برپا ہو (یعنی Enemy Country) تو اس لحاظ سے یہ مسئلہ تعلقات خارجیہ کے قانون سے تعلق رکھتا ہے جس کو ہم آیندہ بیان کریں گے۔ (باقی)

مِراٰۃ المثنوی

مرتبہ جناب قاضی تلمذ حسین صاحب ایم اے رکن دار الترجمہ

مثنوی مولانا روم کا بہترین ایڈیشن جس میں مثنوی شریف کے منتشر مضامین کو ایک سلسلہ کے ساتھ اس طور پر مرتب کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا مولانا کے مدعا اور ان کی تعلیم کو بڑی آسانی سے سمجھتا چلا جاتا ہے کئی انڈکس اور فہرستیں بھی ہیں جنکی مدد سے آپ حسب منشا جو شعر چاہیں نکال سکتے ہیں۔ ایک بسیط فرہنگ بھی ملحق ہے۔ غرض یہ کہ اس کتاب نے مثنوی شریف سے فائدہ اُٹھانے کے لئے ایسی سہولت مہیا کر دی ہے کہ ایک شخص بڑی آسانی سے کتاب کے مطالب پر عبور حاصل کر سکتا ہے۔

کاغذ کتابت بہترین جلد نہایت اعلیٰ قیمت ؏ انگریزی لعہ مجلد

دفتر ترجمان القرآن سے طلب کیجئے